OPEN ACCESS
Al-ISRA
﴾International Journal of Islamic Thought﴿
ISSN: 2959-3603
www.israjr.com

Al-ISRA
Vol.:5, Issue: 1, Jan -March 2026 PP: 344-362

ظہورِ اسلام تک دیگر ادیان سے متعلق کلیسیائی فکری روایت کا ارتقاء

The evolution of the ecclesiastical intellectual tradition regarding other religions untill the emergence of Islam

Salam Ullah Shah
M.Phil Scholar: Department of Interfaith Studies Faculty of Arabic & Islamic Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad
Teachers' Trainer, (Islamic Studies) Read Foundation, Islamabad
Email: salamullahshah28@gmail.com

Dr. Najia Jamil
Ph.D, Department of Islamic Studies, The Women University, Multan
Email: najiajamil9@gmail.com

Syed Adeel Shah
Ph.D Scholar: Department of Islamic Studies, Al-Hamd Islamic University, Islamabad
Lecturer: Islamic Culture, University of Art and Culture, Janshuro, Sindh
Research Associate: Muslim Study Center, Islamabad
Email: syedadeelahmedgilani@gmail.com

Abstract

A proper understanding of Muslim–Christian relations requires an examination of the intellectual and theological background that shaped Christian attitudes toward other religions before the emergence of Islam. This study explores the perspectives of the early Christian Church regarding religious diversity and investigates the scriptural and theological foundations upon which these perspectives were built. Particular attention is given to the influence of the Old and New Testaments in forming Christian views of non-Christian communities, as well as to the attitudes of Church Fathers toward various religious traditions, philosophical schools, and cultural systems that existed in the Greco-Roman world. The study further examines the complex relationship between Christianity and Judaism, the gradual separation of the two traditions, and the diverse Christian responses to Greek philosophy and other intellectual currents. It also traces the historical development of the Church in the Middle East up to the rise of Islam, highlighting the theological debates and ecclesiastical divisions that shaped Christian thought during this

CC BY

period. By analyzing these historical and theological developments, the study provides a framework for understanding the earliest Christian interpretations of Islam and the Muslim community. Since comprehensive Urdu scholarship on this subject remains limited, this research seeks to fill an important gap by presenting a systematic account of the intellectual and religious context within which Christian responses to Islam first emerged.

Keywords: *Early Christian Thought, Christian Views of Other Religions, Jewish-Christian Relations, Patristic Theology, Religious Diversity, Christianity and Hellenism, Eastern Christianity, Interreligious Dialogue, Pre-Islamic Christian Thought, Muslim-Christian Relations.*

تمہید

مسلم مسیحی تعلقات کے تاریخی مطالعے کے لیے یہ جاننا ناگزیر ہے کہ اسلام کے ظہور سے قبل مسیحی کلیسیا دیگر ادیان، تہذیبوں اور فکری روایات کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتی تھی۔ اس ضمن میں یہ سوال خاص اہمیت رکھتا ہے کہ کلیسیائی مفکرین نے اپنے تصورات اور آراء کی تشکیل میں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید سے کس نوعیت کی رہنمائی حاصل کی۔ اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ مختلف تہذیبوں، فلسفیانہ مکاتبِ فکر اور ان کے نمائندہ مفکرین کے بارے میں کلیسیا کا رویہ کیا تھا، جنہوں نے اپنے اپنے ادوار میں انسانی فکر اور تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان سوالات کے جوابات ہمیں اس فکری اور مذہبی پس منظر کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں جس کی بنیاد پر اسلام کے ظہور کے بعد مسیحی علماء اور کلیسیائی رہنماؤں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنے ابتدائی تصورات قائم کیے۔ چنانچہ اسلام کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ان پیشگی فکری رجحانات اور مذہبی رویوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر جامع اور منظّم علمی مواد نہایت کم دستیاب ہے۔ اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ مطالعہ اس خلا کو پُر کرنے اور موضوع کے اہم پہلوؤں کو علمی انداز میں واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔

دیگر مذاہب سے متعلق ابتدائی مسیحیوں کی آراء

اسلام کی آمد کے بعد مسیحی علماء نے مسلمانوں کے بارے میں پہلا ردِ عمل عہد نامہ عتیق کی روشنی میں پیش کیا۔ عہد نامہ عتیق میں یہودیوں کو خدا کی منتخب قوم قرار دیا گیا اور ان کو دیگر اقوام سے ممتاز شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے یہودیوں نے دیگر اقوام اور ادیان کے ساتھ مخاصمت کا رویہ اپنایا اور ان کے ساتھ کشمکش اور تصادم کا ماحول قائم کیا تھا۔ چنانچہ عہد نامہ عتیقسے معلوم ہوتا ہے کہ "ایلیاہ" نبی نے "بعل" اور "اشیرہ" کے نمائندوں (ان کو اردو مترجمین نے بعل کے "نبی" لکھا ہے) کو چیلنج کیا:

"اب تُو قاصد بھیج اور سارے اسرائیل کو اور بعل کے ساڑھے چار سو نبیوں کو اور یسیرت کے چار سو نبیوں کو جو ایزبل کے دستر خوان پر کھاتے ہیں کوہِ کرمل پر میرے پاس اکٹھا کر دے۔ سو اخی اب (بادشاہ) نے سب بنی اسرائیل کو بُلا بھیجا اور نبیوں کو کوہِ کرمل پر اکٹھا کیا۔ اور ایلیاہ سب لوگوں کے نزدیک آکر کہنے لگا تُم کب تک دو خیالوں میں ڈانواں ڈول رہو گے؟ اگر خُداوند ہی خُدا ہے تو اُسکے پیرو ہو جاو اور اگر بعل ہے تو اُسکی پیروی کرو۔ پر اُن لوگوں نے اُسے ایک حرف جواب نہ دیا[1] "۔

لیکن اس نوعیت کے تصادمات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ان کا بنیادی سبب مذہبی تھا یا سیاسی اور علاقائی تھا۔ مخاصمت کے ساتھ ساتھ "شمولیت" کا عنصر بھی عہد نامہ عتیق میں موجود ہے کیونکہ ان میں بعض ایسے غیر اسرائیلی اشخاص کا ذکر بھی ملتا ہے جن کے بارے میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کچھ معرفت رکھتے تھے۔ ایسے افراد یا تو اس برادری میں قبول کر لیے جاتے تھے[2] یا انہیں صراحت کے ساتھ خدا کا کارگزار اور آلہ کار تسلیم کیا جاتا تھا[3]۔

بنی اسرائیل اور عمالیقیوں، کنعانیوں، فلستیوں، شامیوں اور دیگر اقوام کے درمیان، نیز ان کے معبودوں کے درمیان جنگوں کے طویل سلسلے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان برادریوں کے باہمی تعلق میں غالب عنصر تصادم اور دشمنی کا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ "شمولیت پسندانہ روایت" بھی ہمیشہ موجود رہی اور اس کا آفاقی پہلو شاید سب سے زیادہ واضح طور پر یوں بیان ہوا ہے:

"آفتاب کے طلوع سے غروب تے قوموں میں میرے نام کی تمجید ہو گی اور ہر جگہ میرے نام پر بخور جلائیں گے اور پاک ہدیے گزرائیں گے کیونکہ قوموں میں میرے نام کی تمجید ہو گی رب الافواج فرماتا ہے[4]"۔

اس قسم کے متضاد رویوں کا اظہار عہد نامہ عتیق کے آخری حصے کی دو مختصر کتابوں میں بھی ہوا ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب "نحمیاہ(نحوم)" کی ہے جس میں آشوری سلطنے کے دار الحکومت "نینوا" کے سقوط پر جشن، خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب "یونس(یوناہ)" شہر کے باشندے نبی کی دعوت کے نتیجے میں اجتماعی توبہ کرتے ہیں جس کے عوض ان کو اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچالیا جاتا ہے[5]۔ اس کا قرآن مجید میں بھی جزوی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں دونوں کتابیں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کو بیان کرتی ہیں۔

بین العہدین (Inter-testamental) کا دور[6] بھی یہودی قوم کے اندر اسی نوعیت کے رویوں کے ایک سلسلے کو جنم دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً:

ایک طرف مکابیوں کی جانب سے پیش کیا گیا عسکری علیحدگی پسندی اور انحصاریت (Exclusivism) کا رویہ تھا جس کی بنا پر دوسری صدی قبل مسیح میں فلسطین پر یونانی اقتدار کے خلاف بغاوت کی گئی تھی۔ مکابیوں نے نہ صرف غیر ملکی حکمرانی بلکہ غیر ملکی مذہب اور ثقافت کے خلاف بھی معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں یہی رویہ "زیلوٹوں" (Zealots) نے جاری رکھا، جو اپنے مذہبی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کرنے پر بھی آمادہ رہتے تھے۔

اس کے برعکس "ڈائسپورا" (Diaspora) سے تعلق رکھنے والے یہودیوں[7] میں کہیں زیادہ وسعتِ نظری کا رویہ پایا جاتا تھا۔ اس کی بہترین مثال پہلی صدی عیسوی کی شخصیت "فِیلو"(Philo) ہے، جو اسکندریہ کا ایک یہودی تھا۔ اس نے یہودیت کو یونانی فلسفے کی اصطلاحات میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ عبرانی صحائف کا یونانی زبان میں ترجمہ بھی اس کی مثال ہے، جو دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح میں اسی شہر اسکندریہ میں کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ بعد میں "سبعینی ترجمہ" (Septuagint) کے نام سے معروف ہوا کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ستر علماء نے یہ ترجمہ انجام دیا تھا۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ بعض یہودیوں میں خارجی مذہبی افکار کے بارے میں نسبتاً زیادہ کشادہ رویہ موجود تھا۔

ابتدائی مسیحی برادری کے لیے دیگر مذہبی روایات کے بارے میں اس کی فکر کے دو بنیادی پہلو تھے۔

عیسائیت یہودیت کے بطن سے وجود میں آئی تھی جس کی بناپر یہ مضبوطی سے یہودی فکر کی وارث سمجھی جاتی تھی۔

ابتدائی عیسائیت کے عہد میں جس فلسفے اور مذہب کا غلبہ تھا وہ یونانی اور رومی غالب جغرافیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ عیسائیت چاروں طرف سے اسی مذہبی اور فلسفیانہ فکر سے گھری ہوئی تھی۔

گزشتہ پچاس سالوں میں بہت سے علماء نے اس موضوع پر تحقیق اور غور و فکر کیا ہے جسے "راستوں کی علاحدگی" (The Parting of the Ways) کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے مسیحیت آہستہ آہستہ یہودیت سے الگ ایک مستقل مذہب بن گئی، حالانکہ اس کی ابتدا یہودی برادری ہی کے اندر ہوئی تھی۔ اس کیا خیال کو "گیزا ورمش" (Geza Vermes) کے کام کی وجہ سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ایک یہودی شخصیت تھے۔ جب عیسائیت، یہودیت سے الگ ہوئی تو اس میں کچھ ایسے عقائد شامل ہو گئے جو عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ایک یہودی مذہبی استاد اور نبی کی حیثیت سے زندگی گزاری اور اسی سے موافق تعلیمات فراہم کی تھیں۔ اس کو "یسوع کی یہودیت" (Jewishness of Jesus) کا نام بھی دیا جاتا ہے[8]۔ حضرت عیسیٰ کے تمام قریبی پیروکار یہودی تھے۔ وہ یہودی عبادت گاہوں، یعنی "سینیگاگ" (Synagogue) اور ہیکل میں دعا اور عبادت کرتے تھے۔ ان کی تعلیمات کے ابتدائی ترین ریکارڈ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کا پیغام بنیادی طور پر یہودی لوگوں کے لیے تھا[9]۔ تاہم، حضرت عیسیٰ کی بعض تعلیمات نے یہودی برادری کے بہت سے لوگوں کو ناراض کیا اور اختلافات و تنازعات کو جنم دیا۔ بالآخر انہی تنازعات نے رومی حکام کے ہاتھوں حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت میں کردار ادا کیا۔

اس کے بعد بھی حضرت عیسیٰ کے ابتدائی شاگرد ابتدا میں خود کو یہودی ہی سمجھتے رہے اور ہیکل اور سینیگاگ میں عبادت کرتے رہے تھے۔ تاہم یہودیوں کی جانب سے ہیکل اور سینیگاگ میں ان کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض یہودی رہنماؤں کی جانب سے حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کو یہودی جماعتوں سے خارج کرنے کی کوششیں جاری رکھیں جن کے نتیجے میں ایک الگ مسیحی برادری کے وجود میں آنے کی ابتدا ہوئی۔ یہ عمل پولس کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد زیادہ تیز ہو گیا تھا۔

عہد نامہ جدید کی کتاب "اعمال" کے مطابق پولس، حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کے خلاف مہم چلانے والے یہودی رہنماؤں میں شامل تھا۔ عیسائیت قبول کرنے کے اس نے یہ مؤقف اختیار کرنا شروع کیا کہ مسیحیوں کو بعض یہودی مذہبی اعمال ترک کر دینے چاہییں، اور اس طرح اس نے الگ مسیحی جماعتوں کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ "اعمال" میں یروشلم کی مجلس کا ذکر ملتا ہے۔ اس مجلس میں اس سوال پر غور کیا گیا کہ آیا غیر یہودی "نئے مسیحیوں" کے لیے ختنہ کروانا ضروری ہے یا نہیں[10]۔ جب اس کونسل نے بظاہر یہ رائے دی کہ ایسا ضروری نہیں، تو اس نے یہودیت اور مسیحیت کے درمیان علیحدگی کے عمل کو مزید تیز کر دیا۔

یہودیوں اور مسیحیوں کے مابین جو چیز ابتدا میں محض ایک جدائی یا علیحدگی کے طور پر شروع ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ زیادہ مخالفت، تلخی اور یہاں تک کہ شدید نفرت آمیز رویوں کا مرکز بن گئی۔ چنانچہ 70ء میں، جب یہودیوں کی رومی اقتدار کے خلاف بغاوت کے بعد رومیوں نے یروشلم میں واقع یہودی ہیکل کو تباہ کر دیا یہودیوں اور عیسائیوں نے خود کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز حیثیت میں زیادہ واضح طور پر متعین کرنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں دونوں برادریاں رومی حکام کی نظر میں مشکوک

تھیں اور دونوں کو بعض اوقات ظلم و ستم کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس کے باوجود یہودیوں اور مسیحیوں درمیان مناظرانہ اور مخالفانہ تحریروں (Polemics) کا رجحان بڑھنے لگا۔ عہد نامہ جدید میں[11] بھی بعض مسیحیوں کے یہودیت کے بارے میں منفی جذبات اور عداوت کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ابتدائی مسیحی صدیوں میں عہد نامہ جدید کے بعض فقرات[12] کو یہودی برادری کے افراد کے خلاف تشدد اور ظلم و ستم کے جواز کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ بعد میں، جب چوتھی صدی کے آغاز میں مسیحیت رومی سلطنت کا سرکاری مذہب بن گئی تو ریاستی طاقت بھی یہودیوں کے خلاف استعمال ہونے لگی۔ چنانچہ یہودیوں کے عبادت خانوں کو جلانے کی اجازت دی گئی اور یہودیوں کو زبردستی مسیحیت قبول کروانے کو قانونی جواز فراہم کیا گیا۔ اس طرح مسیحی اور یہودی تعلقات میں شدید بگاڑ پیدا ہوا اور مشترک تاریخی و مذہبی پس منظر رکھنے کے باوجود دونوں روایات نے بتدریج ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معاندانہ رویے اختیار کر لیے[13]۔

اس کی ایک نہایت واضح مثال 387 "یوحنا کرائسوستم"(John Chrysostom) کے ان آٹھ خطبات میں ملتی ہے جو اس نے شام کے شہر انطاکیہ میں دیے تھے۔ گفتگو میں فصاحت و بلاغت کی بنا پر اس شخص کا لقب "صاحب اللسان الذھبی" (The golden-tongued) یعنی "سونے کی زبان والا" تھا۔ ان خطبات میں وہ یہودیوں کو ایسے کتوں سے تشبیہ دیتا ہے جو شکم پرستی، شراب نوشی اور شہوت پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ان کے عبادت خانے تھیٹروں، قحبہ خانوں یا چوروں کے اڈوں سے بہتر نہیں ہیں۔ ان کی روحیں شیاطین کے مسکن اور بت پرستی کے مراکز بن چکی ہیں۔ ان سے ایسے بچنا چاہیے جیسے کسی گندی وبا سے بچا جاتا ہے جو پوری دنیا کے لیے خطرہ ہو۔ یہاں تک کہ ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ وہ اب کسی اور مقصد کے لیے موزوں نہیں رہے سوائے اس کے کہ انہیں قتل کر دیا جائے[14]۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انطاکیہ کی مسیحی برادری اب بھی یہودیت کے بعض پہلوؤں کو پرکشش سمجھتی تھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان خطبات کی شدید تلخ اور جارحانہ زبان کو ایک ایسی خطیبانہ فصاحت کے طور پر دیکھنا چاہیے جس کا مقصد مسیحیوں کو ان کی الگ اور ممتاز شناخت یاد دلانا تھا۔ تاہم اس حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ان خطبات کا منفی اور معاندانہ لہجہ قرونِ وسطیٰ اور جدید مسیحی معاشروں میں یہودی بستیوں (Ghettos) کے ظہور اور فروغ میں ایک اہم معاون عنصر ثابت ہوا[15]۔

دوسری طرف جان کرائسوستم اور دیگر مصنفین کے سخت اور تند و تیز لسانی حملوں کے ساتھ ساتھ بعض اوقات یہودیوں کے بارے میں زیادہ مثبت رویے بھی ملتے ہیں۔ مسیحیوں اور یہودیوں کے درمیان انفرادی دوستیوں کی مثالیں بھی موجود تھیں۔ اس لیے "قسطنطین"(Constantine) کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد مسیحی اور یہودی تعلقات کی مجموعی تصویر مکمل طور پر تاریک اور مسلسل دشمنی پر مبنی نہیں تھی۔

یونانی اور رومی فلسفے کے بارے میں مسیحی رویے زیادہ متنوع تھے۔ خود عہد نامہ جدید میں بھی اگرچہ حضرت عیسیٰ کا پیغام بنیادی طور پر یہودیوں کے لیے معلوم ہوتا ہے، تاہم عہد نامہ عتیق کی طرح اس میں متعدد ایسے واقعات اور حکایات موجود ہیں جن میں غیر یہودی افراد کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں ایک رومی صوبیدار اور ایک سامری عورت کے ساتھ مثبت ملاقاتوں کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کی مشہور ترین تمثیلوں میں سے ایک میں ایک ایسے سامری شخص کا ذکر موجود

ہے جسے ہمدردی اور خیر خواہی کے باعث ایک مثالی نمونہ قرار دے کر سراہا گیا ہے۔

یہودیوں اور حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کے درمیان تعلقات میں بگاڑ پیدا ہونے کے نتیجے میں ابتدائی مسیحیوں نے بتدریج اس یقین کا اظہار کرنا شروع کیا کہ حضرت عیسیٰ کا پیغام صرف یہودیوں کے لیے نہیں بلکہ غیر یہودیوں کے لیے بھی ہے۔ عہد نامہ جدید میں اس کی عکاسی تین مجوسی دانشمندوں کے قصہ میں ہوتی ہے[16] جو مشرق سے حضرت عیسیٰ کو تحائف پیش کرنے کے لیے آئے تھے۔ اسی طرح "اعمال" میں رومی صوبیدار "کرنیلیس" کے بارے میں پطرس کے حوصلہ افزا رویا کا اظہار بھی ملتا ہے[17]۔ تاہم پولس ہی وہ شخصیت ہے جو علاحدگی عمل کو زیادہ آگے بڑھاتا ہے۔ کتاب "اعمال" بحیرۂ روم کے گرد پولس کے سفروں کو بیان کرتی ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ پولس نے یونانی مذہب کے ساتھ دو مختلف انداز اختیار کیے:

پولس نے یونانی فلسفے کے بارے میں کافی مثبت اور کھلا رویہ اپنایا۔ انہوں نے ایک ایسی قربان گاہ کا ذکر کیا جو "نامعلوم خدا" کے نام سے منسوب تھی اور کہا کہ یہی نامعلوم خدا دراصل وہی خدا ہے جس کی وہ تبلیغ کر رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مسیحیت ایتھنز کے لوگوں کے عقائد کی مکمل مخالفت نہیں کرتی بلکہ ان کی جستجو کے سفر کی تکمیل کرتی ہے[18]۔

بعض اوقات پولس کا انداز زیادہ سخت اور تنقیدی بھی تھا۔ اس نے دیوی "اَرتمِس/ڈیانا[19]" کی عبادت پر تنقید کی اور تعلیم دی کہ ایسی عبادت کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں ہے۔

لہٰذا، پولس بعض اوقات دوسرے مذاہب اور روایات کے ساتھ رابطہ اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا جبکہ بعض مواقع پر وہ ان کی سخت مخالفت اور تردید کرتا تھا۔

آبائے کلیسا کے دور میں بھی یونانی فلسفے کے بارے میں مختلف رویے مسیحی کلیسا کے مختلف حصوں میں پروان چڑھے۔ مسیحی فکر کا ایک دھارا[20] مسیحی پیغام کی انفرادیت پر زور دیتا تھا اور اس بات کا حامی تھا کہ مسیحی برادری کو اپنے اردگرد کے فکری اثرات سے الگ رہنا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کی سب سے مختصر اور مشہور نمائندگی شمالی افریقی مسیحی مفکر "ٹرٹولیان" (Tertullian) کے اس معروف قول میں ملتی ہے:

ایتھنز (فلسفے کے مرکز) کا یروشلم (وحی کے مرکز) سے کیا تعلق ہے؟"۔

تاہم، سلطنت کے مشرقی حصے[21] میں ایک زیادہ شمولیت پسند (Inclusive) اور آفاقی روایت نے جنم لیا۔ اس روایت کی نمائندگی دوسری صدی میں "جسٹن شہید" (Justin Martyr) اور "کلیمنٹ اسکندریائی" وغیرہ کرتے ہیں۔ جسٹن شہید نے مسیحیت کو "حقیقی فلسفہ" قرار دیا، جبکہ کلیمنٹ نے یہ تجویز کیا کہ حضرت عیسیٰ کے ذریعے آنے والی نجات اپنی وسعت میں عالمگیر ہوگی۔ چنانچہ جسٹن نے لکھا:

"ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ لوگ۔۔۔ جو اس بھلائی کو انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، خدا (کی سلطنت) میں ایک حصہ رکھتے ہیں،۔۔۔ وہ لوگ خدا کے فضل سے اس کے مسکن میں شریک ہوں گے۔ اصولی طور پر یہ بات سب لوگوں پر لاگو ہوتی ہے"۔

کلیمنٹ کا کہنا ہے کہ:

"غور و فکر اور براہِ راست مشاہدے کے ذریعے، یونانیوں میں سے وہ لوگ خدا کو پہچان لیتے ہیں، جنہوں نے صحیح طور پر

فلسفہ اختیار کیا ہے[22]"۔

اس روایت میں یونانی فلاسفہ میں سے "افلاطون" اور "ارسطو" وغیرہ کو ایک لحاظ سے اعزازی مسیحی بنادیا گیا تھا۔ افلاطون کی کتاب "جمہوریہ" (Republic) کے بعض اقتباسات[23] کسی نہ کسی انداز میں مسیح علیہ السلام سے متعلق پیش گوئی پر مبنی سمجھے جاتے تھے۔ ان اقتباسات کو مسیحی عقائد کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا تھا اور ان میں حضرت عیسیٰ کی آمد اور مصلوبیت کی پیشگی جھلک تلاش کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس روایت میں زیادہ زور مخالفت، تصادم یا علیحدگی پر نہیں بلکہ "امتزاج" اور "مطابقت" پر تھا[24]۔

تاہم عہد نامہ جدید کے بعض حصوں اور بعض آبائے کلیسا کی تحریروں میں ان لوگوں کے بارے میں نہایت سخت زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً یوحنا کے پہلے خط میں دجال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"جھوٹا کون ہے سوائے اس کے جو اس بات کا انکار کرے کہ یسوع ہی مسیح ہے؟۔ یہی دجال ہے[25]"۔

یہ بھی کہ:

"ہر وہ روح جو اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ یسوع مسیح جسم میں آکر ظاہر ہوا ہے، خدا کی طرف سے ہے؛ اور ہر وہ روح جو یسوع کا اقرار نہیں کرتی، خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہی دجال کی روح ہے[26]"۔

یہ واقعی نہایت سخت زبان ہے، لیکن اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اس کا اصل ہدف مسیحی برادری کے باہر کے لوگ نہیں تھے، بلکہ وہ افراد تھے جو خود مسیحی برادری کے اندر موجود تھے اور جن کے بارے میں مصنف کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ کے متعلق انتہائی مشتبہ اور ناقابلِ قبول نظریات اختیار کر رہے ہیں۔ ان خطرناک سمجھے جانے والے عقائد کی نوعیت کے بارے میں سب سے زیادہ قابلِ قبول رائے یہ ہے کہ ان میں "ایبیونیت[27]" (Ebionism) اور "غناسطیت[28]" (Gnosticism) کا کوئی نہ کوئی امتزاج شامل تھا۔ یہ امتزاج پہلی صدی عیسوی کے آخر میں "سرنتھس" (Cerinthus) کے نظریات میں دیکھا جاسکتا ہے[29]۔ سرنتھس کا استدلال تھا کہ حضرت عیسیٰ ایک عام انسان تھے جنہیں ان کے بپتسمہ کے وقت خدا نے ایک خاص مشن کے لیے منتخب کیا۔ اسی موقع پر انہیں ایک خاص قسم کی حکمت عطا کی گئی۔ تاہم مصلوب کیے جانے سے پہلے وہ حکمت ان سے جدا ہو گئی۔ بالفاظِ دیگر یہ انتہائی منفی فیصلہ ایسے لوگوں کے بارے میں نہیں تھا جو مکمل طور پر عیسائیت سے باہر تھے، بلکہ ان افراد کے بارے میں تھا جو عیسائیت کے اندر موجود تھے لیکن کسی نہ کسی طرح اس کی شناخت اور عقیدے کے لیے خطرہ سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح عہدِ جدید میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے منسوب بہت سے سخت اور مناظرانہ بیانات بھی اصل میں ان کی اپنی (یہودی) برادری کے ان افراد کے خلاف تھے جن سے وہ اختلاف رکھتے تھے۔ مثلاً:

"جب اُس نے بہُت سے فریسیوں اور صدُوقیوں کو بپتِسمہ کے لئے اپنے پاس آتے دیکھا تو اُن سے کہا کہ اَے سانپ کے بچّو تُم کو کِس نے جتادِیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟[30]"۔

عہد نامہ جدید کے بعض ایسے بیانات کو سمجھتے وقت بھی ان کے تاریخی اور ادبی سیاق و سباق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، جنہیں مسیحیوں نے اکثر ایک انحصاری (Exclusive) انداز میں سمجھا ہے، یعنی اس معنی میں کہ نجات کے حق دار صرف

مسیحی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ جن دو آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ: "راہ اور حق اور زِندگی مَیں ہُوں کوئی میرے وسِیلہ کے بغَیر باپ کے پاس نہیں آتا[31]۔

پطرس کا کہنا ہے کہ: "اور کسی دُوسرے کے وسِیلہ سے نجات نہیں بخشا گیا جِس کے وسِیلہ سے ہم نجات پا سکیں[32]"۔

عیسائی علماء کا کی رائے ہے کہ یوحنا کی انجیل میں مذکور اس قول کو اس کے مخصوص پس منظر میں سمجھنا چاہیے۔ ان کے مطابق یہ قول ایک ایسے یوحناوی (Johannine) مسیحی گروہ کے ماحول میں سامنے آیا جو اپنی شناخت کے اعتبار سے نہایت فرقہ وارانہ اور الگ تھلگ تھا۔ چنانچہ اس نوعیت کے انحصاری اور قطعی بیانات اس برادری کی منفرد اور مخصوص اجتماعی شناخت کو مضبوط بنانے کا ذریعہ تھے۔ اسی طرح "اعمال" میں پطرس کے بیان کو بھی اس کے فوری پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ پطرس، ہیکل میں ایک لنگڑے شخص کے شفا پانے کے واقعے کا نہایت جوش وجذبے کے ساتھ دفاع کر رہا تھا[33]۔ لہٰذا جدید تحقیق کے مطابق ان فقرات کو محض عمومی اور مطلق مذہبی فیصلوں کے طور پر نہیں، بلکہ ان مخصوص حالات اور گروہوں کے تناظر میں بھی سمجھنا ضروری ہے جن میں یہ بیانات سامنے آئے تھے۔

عہد نامہ جدید کے بعض دیگر حصوں میں رومی ریاست کے بارے میں بھی نہایت سخت زبان استعمال کی گئی ہے۔ جب پہلی صدی عیسوی میں شہنشاہ "نیرو" (Nero) کے دور سے رومی حکومت نے مسیحیوں پر ظلم وستم شروع کیا تو میں رومی سلطنت کو قیامت اور آخرت سے متعلق علامتی زبان میں "درندہ" کہا جانے لگا[34]۔

اس سے پہلے مسیحیوں کا رویہ یہ تھا کہ وہ خود کو رومی سلطنت کے وفادار شہریوں کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بدلتے ہوئے حالات نے اس مؤقف میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ جب ظلم وستم میں اضافہ ہوا تو ان کے رویوں میں بھی تبدیلی آئی اور فطری طور پر رومی ریاست کے بارے میں کہیں زیادہ مخالفت اور معاندانہ جذبات نمایاں ہونے لگے۔ یہ مخالفانہ رویہ ابتدائی مسیحی صدیوں میں برقرار رہا اور طویل عرصے تک مسیحی فکر اور طرزِ اظہار میں اس کے اثرات محسوس کیے جاتے رہے۔

چنانچہ جب مسلمان تاریخ کے منظر پر نمودار ہوئے تو یہ وہ چند فکری اور مذہبی روایات تھیں جن سے مسیحی برادری اسلام کے بارے میں اپنے ردِ عمل اور اس کی تعبیر و تشریح مرتب کرنے کے لیے استفادہ کر سکتی تھی۔ اس زمانے میں اسلام کے بارے میں مسیحی ردِ عمل کی ایک خاصی متنوع صورت سامنے آئی، اور کوئی ایک ایسا مسیحی نقطۂ نظر وجود میں نہیں آیا جسے تمام مسیحیوں نے عالمگیر طور پر قبول کر لیا ہو۔ مسیحی صحائف اور ابتدائی مسیحی فکر میں موجود آراء اور رویوں کے اس وسیع تنوع کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت دراصل کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں مسیحی کلیسیا کا ارتقاء

اسلام اور مسیحی کلیسیا میں ایک مشترک پہلو یہ ہے کہ دونوں کی ابتداء مشرقِ وسطیٰ میں ہوئی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسیحی کلیسا کی تاریخ اور ارتقا کا بھی کچھ بیان کیا جائے کیونکہ اس ابتدائی دور سے تو زیادہ تر جدید مسیحی عمومی طور پر واقف ہیں۔ تاہم اس کے بعد کے تقریباً 600 سالہ ارتقائی تاریخ، کم از کم بہت سے جدید مغربی مسیحیوں کے لیے، کم معروف ہے۔ اس لیے

یہ ضروری ہے کہ مسلم سماج کے قیام سے پہلے کی صدیوں میں مسیحی کلیسا کے ارتقا کی اہم خصوصیات کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔

اس دور میں غالباسب سے اہم تبدیلی چوتھی صدی کی دوسری دہائی میں رومی شہنشاہ "قسطنطین" (Constantine) کے مسیحیت قبول کرنے کے نتیجے میں رونماہوئی۔ مسیحی کلیسا، جو اس سے پہلے ایک اقلیتی برادری تھی اور جس کے پاس سیاسی اثر ورسوخ یااقتدار نہ ہونے کے برابر تھا، اچانک بحیرۂ روم کی دنیا کی سب سے طاقتور ریاست کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس طرح کلیسااور ریاست کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو گئے۔ نتیجتاً بعض مسیحی بشپ سیاسی میدان میں نہایت بااثر کردار ادا کرنے لگے، اور بعض اوقات ریاستی طاقت کو بھی مسیحی برادری کے اندر مخصوص گروہوں کے اثر ورسوخ کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا[35]۔

قسطنطین (Constantine) کے مسیحیت قبول کرنے کی ایک اہم وجہ یہ امید بھی تھی کہ مسیحی مذہب سلطنت کے لیے اتحاد کا مرکز بن سکتا تھااور اس طرح رومی سلطنت میں دوبارہ قوت اور استحکام پیدا ہو سکتا تھا۔ تاہم، اگلی چند صدیوں کی پیش رفت نے جلد ہی واضح کر دیا کہ یہ امید پوری نہیں ہو سکی، کیونکہ مسیحی کلیسا کے اندر تقسیمات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا، جس کے نتیجے میں مختلف مسیحی گروہ وجود میں آئے اور مستقل طور پر قائم ہو گئے۔اس نوعیت کے اختلاف اور مناظرے یقینا کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ پہلی تین صدیوں کے دوران بھی بہت سے شدید فکری اور مذہبی مباحث جاری رہے تھے۔ لیکن مسیحیوں کی اقلیتی حیثیت، اور وہ ظلم و ستم جس کا انہیں وقفے وقفے سے سامنا کرناپڑتا تھا، غالبااس بات کا سبب بنی کہ ابتدائی اختلافات اس طرح مستقل ادارہ جاتی شکل اختیار نہ کر سکے جس طرح قسطنطین کے دور کے بعد پیدا ہونے والی تقسیمات نے اختیار کر لی۔

چنانچہ ساتویں تک پہنچتے پہنچتے مسیحی کلیسا گہری تقسیم کا شکار ہو چکا تھا۔ یہی ان الزامات میں سے ایک تھاجو قرآن نے مسیحیوں پر واضح طور پر عائد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ :

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوااِنَّانَصَارٰىٓ اَخَذْنَامِيثَاقَهُمْ فَنَسُواحَظًّامِّمَّاذُكِّرُوا بِهِ فَاَغْرَيْنَابَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يوْمِ الْقِيامَةِ ۚوَسَوْفَ ينَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَاكَانُو ايصْنَعُونَ[36]

مفہوم: اور جو اپنے آپ کو نصرانی کہتے ہیں ہم نے ان سے بھی عہد و پیمان لیا، انہوں نے بھی اس کا بڑا حصہ فراموش کر دیاجو انہیں نصیحت کی گئی تھی، تو ہم نے بھی ان کے آپس میں بغض وعداوت ڈال دی جو تاقیامت رہے گی اور جو کچھ یہ کرتے تھے عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں سب بتادے گا۔

جزوی طور پر یہ تقسیمات خود رومی سلطنت میں پیداہونے والی اس تقسیم کے مطابق تھیں جو چوتھی صدی میں سلطنت کے مشرقی اور مغربی حصوں میں بٹ جانے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ چنانچہ :

سلطنت کے مغربی، لاطینی زبان بولنے والے حصے میں موجود مسیحی کلیسانے مسیحی عقیدے کی اپنی ایک مخصوص تعبیر و تفہیم کو فروغ دیناشروع کیا۔ اس میں "قانون" (law) پر خاص زور تھا، جس کے نتیجے میں "نجات" اور "فدیہ" (redemption) مغربی الہیات کا مرکزی موضوع بن گیا، اور عبادت میں اس کا اظہار اس صورت میں ہوا کہ "قربانی" (sacrifice) کو قلبی اور بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اس کے برعکس، سلطنت کے مشرقی حصے کا کلیسا، جو زیادہ تر یونانی زبان بولتا تھا، فلسفے کی زبان سے زیادہ مانوس تھا۔ چنانچہ مشرقی مسیحی الہیات میں "تألّہ" (Deification) یاانسان کے الٰہی قرب کے تصور پر زیادہ توجہ دی گئی، اور عبادت میں

زور زیادہ "یوخرست" (Eucharist) یعنی شکر گزاری پر رہا۔

اس طرح ایک حد تک مشرقی اور مغربی کلیسا محض بتدریج ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ یہ عمل اس وقت مزید تیز ہو گیا جب 476ء میں رومی سلطنت کا مغربی حصہ ختم ہو گیا، جبکہ مشرقی حصہ تقریباً ایک ہزار سال مزید قائم رہا۔ اگرچہ مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان باضابطہ علیحدگی 1054ء میں وقوع پذیر ہوئی، جسے عموماً "عظیم انشقاق" (Great Schism) کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان اصل جدائی اس سے کئی صدیاں پہلے، مسلم سماج کے وقوع سے بھی قبل، ہی رونما ہو چکی تھی[37]۔

ایک اختلاف ایسا بھی تھا جو مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان تقسیم کا اصل سبب تو نہیں تھا، لیکن بعد میں پیدا ہوا۔ یہ اختلاف "فیلیوک شق" (filioque clause) سے متعلق تھا۔ یعنی مسیحی عقیدہ نامہ[38] میں اس سوال کا جواب شامل کرنے پر بحث ہوئی کہ مسیحیوں کو "روح القدس" (Holy Spirit) کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیے:

مشرقی کلیسا میں یہ عقیدہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ روح القدس "باپ سے صادر ہوتی ہے"۔

مغربی کلیسا میں، غالباً آٹھویں صدی کے آخر میں اسپین سے شروع ہونے والے ایک رجحان کے تحت، یہ تعلیم دی جانے لگی کہ روح القدس "باپ اور بیٹے سے صادر ہوتی ہے"۔ لفظ "Filioque" دراصل لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "اور بیٹے سے"۔

یہ اختلاف نہ صرف مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان سب سے اہم اور شدید تنازع کا باعث بننے والے مسائل میں سے ایک تھا، بلکہ آج تک ان کے درمیان اختلاف کا ایک بنیادی نکتہ شمار ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اسی اختلاف نے اسلام کے بارے میں مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے ردِ عمل اور رویوں میں بھی بعض اہم فرق پیدا کیے۔

ابتدائی صدیوں میں مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان ایک اور اہم فرق "قیادت" اور "اختیار" کے مختلف تصورات سے متعلق تھا۔ ابتدائی مسیحی برادری کے اہم مراکز میں سے صرف ایک مرکز، یعنی روم مغرب میں واقع تھا، جبکہ یروشلم، انطاکیہ اور اسکندریہ مشرق میں واقع تھے۔ بعد ازاں جب قسطنطنیہ[39] (موجودہ استنبول) کو بھی ایک پاپائی مرکز (Patriarchate) کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسائی لحاظ سے چار بڑے اور اہم مراکز مشرق میں موجود ہو گئے۔ اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق میں کسی ایک مرکز کے لیے اپنی برتری اور فوقیت کا دعویٰ کرنا زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ مشرقی کلیسا میں اختیار اور قیادت کے بارے میں نظریات زیادہ مجلسی اور شورائی (Conciliar) نوعیت کے تھے۔ یعنی فیصلے اجتماعی مشاورت اور کلیسائی مجالس کے ذریعے کیے جاتے تھے۔ اس کے برعکس مغرب میں صرف ایک بڑا مرکز موجود تھا جس کے نتیجے میں اقتدار اور اختیار نسبتاً زیادہ ایک جگہ مرتکز ہو گیا اور بعض اوقات پاپائیت (Papacy) نے اپنے لیے اعلیٰ ترین اور حتمی اختیار کا دعویٰ بھی کیا تھا۔

اگر مسلمانوں کے ظہور سے پہلے مسیحی کلیسا کے اندر سب سے بڑی اور اہم تقسیم مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان تھی تو اس کے بعد جلد ہی دیگر اختلافات بھی سامنے آنے لگے۔ یہ اختلافات خصوصاً مشرقی کلیسا میں تھے۔ مغرب میں شاید "ڈوناٹسٹ تحریک[40]" (Donatism) سب سے گہری تقسیم کا سبب بنی۔ شمالی افریقہ سے مسیحی کلیسیا کا خاتمہ کیوں ہوا؟۔ بعض

آراء کے مطابق اس تحریک کا مطالعہ کرنے سے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ تاہم سب سے گہری اور دیرپا تقسیمات مشرقی کلیسا میں پیدا ہوئیں اور ان اختلافات و تقسیمات کا مرکزی موضوع "مسیحیات" (Christology) تھا۔ یعنی وہ مسیحی بحث جس کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اور فطرت کے ساتھ ہے۔

ان تقسیمات کی جڑیں ابتدائی صدیوں میں کلیسا کے اندر پیدا ہونے والے ان فکری مکاتب میں تھیں جن کے مسیحیات (Christology) کے بارے میں مختلف رجحانات اور ترجیحات تھیں۔ ایک طرف "مکتبِ انطاکیہ" (Antiochene School) تھا، جس کا مرکز شام کا شہر انطاکیہ (Antioch) تھا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کے لیے پہلی مرتبہ "مسیحی" (Christian) کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی[41]۔ یہ مکتب حضرت عیسیٰ کی کامل انسانیت پر خاص زور دیتا تھا۔ فلسفیانہ اعتبار سے بھی اس میں ارسطوی تجربیت کے لیے ایک حد تک تحسین اور میلان پایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس "مکتبِ اسکندریہ" (Alexandrian School) کا رجحان زیادہ تر "لوگوس مسیحیات" (Logos Christology) کی طرف تھا۔ اس میں حضرت عیسیٰ کو "کلمۂ خدا" (Word of God) کے طور پر نمایاں کیا جاتا تھا۔ یہ تصور اسکندریہ کے یہودی مفکر "فِیلو" (Philo) نے فروغ دیا تھا۔ اسی طرح یونانی فلسفیانہ روایت سے استفادہ کرتے ہوئے مکتبِ اسکندریہ میں "افلاطونی تصوف" کے لیے بھی زیادہ ترجیح اور میلان پایا جاتا تھا۔

کئی صدیوں تک یہ مکاتبِ فکر محض فکری رجحانات اور ترجیحات کی حیثیت رکھتے رہے۔ اختلافات کے باوجود ان کے درمیان اکثر مفید علمی تعامل بھی ہوتا رہا۔ لیکن پانچویں صدی میں ان اختلافات میں زیادہ شدت اور تلخی پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں الگ الگ مذہبی برادریاں اور کلیسائی نظام قائم ہونے لگے۔ یہ عمل سب سے پہلے پانچویں صدی میں اس وقت شروع ہوا جب قسطنطنیہ کے مذہبی رہنما (Patriarch) "نسطوریئس" (Nestorius) پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ حضرت مسیح کی انسانی اور الٰہی فطرتوں کے درمیان حد سے زیادہ فاصلہ قائم کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں 431ء میں منعقد ہونے والی "افسس کی مجلس" (Council of Ephesus) میں اسے بدعتی قرار دے دیا گیا۔ نسطوریئس کو اس کے منصب سے معزول کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن اس کے نظریات شام اور اس سے مشرق کی جانب خصوصاً عراق اور ایران میں بہت سے مسیحیوں کے لیے کافی پرکشش ثابت ہوئے۔ چنانچہ ایک الگ "نسطوری کلیسا" (Nestorian Church) وجود میں آگیا۔ اگلے چند برسوں میں، جزوی طور پر نسطوریئس کے نظریات کے ردِعمل کے طور پر ایک ایسا نظریہ سامنے آیا جس میں حضرت مسیح کی الٰہی فطرت پر خاص زور دیا گیا اور ان کی انسانیت کو نسبتاً کم اہمیت دی گئی۔ افسس کی مجلس کے تقریباً بیس سال بعد قسطنطنیہ کے قریب خلقیدون (Chalcedon) میں ایک اور مجلس منعقد ہوئی۔ اس کونسل نے قسطنطنیہ کے ایک راہب ایوٹیکیز (Eutyches) کے نظریات کو مسترد کر دیا۔ اس کے نظریات بعد میں "مونوفیزیت" (Monophysitism) کے نام سے معروف ہوئے۔ ان کو کلیسیا نے بدعتی نظریات قرار دیا۔ تاہم ایک مرتبہ پھر یہ نظریات بازنطینی سلطنت کے بعض علاقوں خصوصاً شام اور مصر میں، کافی مقبول ثابت ہوئے۔ اس کے نتیجے میں ان خطوں میں الگ "مونوفیزی کلیسائیں" (Monophysite Churches) قائم ہو گئیں۔

چنانچہ پانچویں صدی کے اختتام تک مشرقی کلیسا اب متحد نہیں رہا تھا۔ پھر بھی ان تمام کلیساؤں کو "آرتھوڈوکس"

(Orthodox) کلیسائیں کہاجاتاہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب مشرقی کلیسائیں ہیں اور ایک مشترک فلسفیانہ روایت اور عبادتی طرز رکھتی ہیں۔اس کے باوجود قسطنطنیہ (Constantinople) میں قائم یونانی کلیسا[42]اور نسطوری (Nestorian) اور مونوفیسائٹ (Monophysite) کلیساؤں[43] کے درمیان شدید اور تلخ مخالفت پیدا ہو چکی تھی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ یہاں صرف الہیات ہی موضوعِ نزاع نہیں تھی بلکہ سیاسی عوامل بھی اس میں شریک تھے۔ایک طرف رومی سلطنت کی سرحدوں سے باہر مسیحی کلیسا کے پھیلاؤ نے اس صورتِ حال میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ :

ایک طرف نسطوریئس (Nestorius) کے نظریات فارسی سلطنت (Persian Empire) کے مسیحی باشندوں میں مقبول تھے۔اس وجہ سے رومی سلطنت کے اندر رہنے والے نسطوریوں کی وفاداری کسی حد تک مشکوک سمجھی جانے لگی۔

دوسری طرف بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) کے مرکزی اقتدار کے خلاف اس کی دور دراز صوبائی ریاستوں[44]میں پائی جانے والی ناراضی اور بے اطمینانی بھی مذہبی علیحدگی پسندی کے پس منظر میں ایک اہم عنصر تھی۔ وجوہات جو بھی رہی ہوں، نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحی کلیسا کے اندر مزید گہری تقسیم پیدا ہو گئی، جو عقیدتی والہیاتی خطوط کے ساتھ ساتھ جغرافیائی خطوط پر بھی قائم تھی۔ مسلم سماج کے ظہور کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کی اہمیت کو جتنا بھی نمایاں کیا جائے کم ہے[45]۔

یہ حقیقت اس وقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم جزیرۂ عرب میں مسیحی کلیسا کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی خطہ تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے مسلم سماج کا اصل مرکز تھا۔ چھٹی صدی میں عرب ایک لحاظ سے اپنی الگ دنیا تھا، جو آزاد تھا اور اُس زمانے کی دو بڑی سلطنتوں، یعنی بازنطینی سلطنت اور ساسانی فارسی سلطنت میں سے کسی کا حصہ نہیں تھا۔ تاہم، خشکی کے راستے اس کی سرحدیں انہی دو سلطنتوں سے گھری ہوئی تھیں۔ بلکہ ایک اعتبار سے عرب ان دونوں کے درمیان سرحدی خطے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ عرب ان دونوں سلطنتوں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ چنانچہ حضرت محمد ﷺ کے زمانے سے پہلے یہ دونوں ریاستیں عرب کے بعض علاقوں پر اپنا اثر و رسوخ اور اقتدار بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

لہٰذا اگر ہم حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے ذرا پہلے کے زمانے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی کلیسا کے مختلف دھڑے عرب کی سرحدوں پر اچھی طرح قائم ہو چکے تھے۔ شمال مغرب کی جانب یعنی یروشلم اور بحیرۂ روم کے رخ پر بازنطینی سلطنت کی سرحد کے قریب آباد بعض عرب قبائل نے چوتھی صدی سے مسیحیت قبول کرنا شروع کر دی تھی۔ درحقیقت ایک رومی شہنشاہ، "مارکس جولیئس فلپُّس[46]" (Marcus Julius Philippus) مسیحی تھا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بطور شہنشاہ اپنے مسیحی عقیدے کا کھل کر اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے مذہبی رجحان کو اپنی ذاتی زندگی تک محدود رکھا[47]۔ بعد میں ایک اہم عرب قبیلہ "بنو غسان" بھی ان متعدد قبائل میں شامل تھا جنہوں نے غالباً چوتھی صدی میں مسیحیت قبول کی۔ پھر چھٹی صدی میں غسانیوں کو اس خطے میں سیاسی برتری حاصل ہو گئی کیونکہ بازنطینی حکام نے ان کے سردار "حارث بن جبلۃ" قبائلی سردار اور علاقائی قائد کے طور پر مقرر کر دیا تھا۔

اس مقام پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ اس دور میں کئی عرب قبائل کا مسیحیت قبول کرنا محض مذہبی یا الٰہیاتی

عقیدے کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ ثقافتی وابستگی کے اظہار اور سیاسی وفاداری کی علامت بھی تھا۔ یہ اس حد تک تھا کہ ایک معنی میں میسیحیت کا پھیلاؤ بعض اوقات بازنطینی سلطنت کی خارجہ پالیسی کے تسلسل اور توسیع کے طور پر کام کرتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سرحدی علاقوں میں "آرتھوڈوکس میسیحیت" پھیلی۔ یعنی وہ میسیحیت جو "خلقیدون کی کونسل" کے فیصلوں کو تسلیم کرتی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس "مونوفیزی میسیحیت" وہاں غالب ہو گئی۔ "غسانی" بھی اس کے پیروکاروں میں شامل تھے۔ یہ حقیقت مستقبل میں خاصی اہمیت کی حامل ثابت ہونے والی تھی۔ درحقیقت اس پورے خطے میں مسیحی کلیسا کی عمومی نوعیت مرکزی دھارے کی مسیحی فکر اور عمل سے کسی حد تک مختلف ہو چکی تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ چوتھی صدی میں شام کے صحرا میں "رہبانیت" نے جنم لیا جو وسیع تر کلیسا کے اندر رونما ہونے والی بعض تبدیلیوں کے خلاف ایک قسم کے احتجاج کے طور پر ابھری تھی۔

عرب کے شمال مشرقی سرحدی علاقے[48] میں بعض عرب قبائل میں مسیحی پیغام کے پھیلاؤ کا ایک مشابہ عمل وقوع پذیر ہوا۔ تاہم یہاں کلیسا کی ایک مختلف شاخ نے جڑیں پکڑیں۔ سیاسی اعتبار سے اس خطے کا ایک اہم قبیلہ "لخم" (Lakhm) تھا، جو چھٹی صدی میں غسانیوں (Ghassānids) کا سب سے بڑا حریف تھا۔ اس قبیلے کا ساسانی سلطنت کے ساتھ تقریباً ویسا ہی سرپرستانہ اور اتحادی تعلق تھا جیسا غسانیوں کا بازنطینی سلطنت کے ساتھ تھا۔ 583ء سے 602ء کے درمیان اس قبیلے کے حکمران "نعمان بن منذر" نے میسیحیت قبول کر لی تھی لیکن وہ جس کلیسا سے وابستہ ہوئے وہ "نسطوری کلیسا" (Nestorian Church) تھا۔ یہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ فارسی سلطنت کے اندر نسطوریت (Nestorianism) کا اثر و رسوخ خاصا مضبوط تھا۔ لخمی دارالحکومت الحیرہ چوتھی صدی سے ہی نسطوریت کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ مزید جنوب کی طرف خلیج کے مشرقی ساحلوں پر بھی نسطوریت نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ یہ بھی جزوی طور پر فارسی ثقافتی اور سیاسی اثر و رسوخ کے پھیلاؤ سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ "بحرین[49]" میں نسطوری بشپ موجود تھے[50]۔

عرب کے اطرافی علاقوں میں تیسرا خطہ جزیرۂ عرب کا جنوب مغربی گوشہ ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو آج "یمن" سے موسوم ہے۔ یہاں بھی مسلم سماج کے قیام سے کئی صدیوں پہلے میسیحیت قائم ہو چکی تھی اور اس کے پھیلاؤ کا ذریعہ بحیرۂ احمر (Red Sea) کے پار واقع مسیحی سلطنت "اکسوم" (Axum) تھی جو موجودہ "ایتھوپیا" (Ethiopia) اور "اریٹیریا" (Eritrea) کے علاقوں میں واقع تھی۔ ایک بار پھر یہاں مونوفیزی میسیحیت ہی نمایاں تھی۔ اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر مسیحی کلیسا جنوبی عرب پر بہت گہرا اثر نہیں ڈال سکا تاہم کم از کم ایک مقام پر اسے خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا، اور وہ مقام "نجران" کا شہر تھا۔

اب تک عرب میں مسیحی اثرات کی جن مثالوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ سب جزیرۂ عرب کے سرحدی یا اطرافی علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے وہاں میسیحیت کے پھیلاؤ کے شواہد نسبتاً آسانی سے دستیاب ہیں کیونکہ عرب کے گرد و نواح کی ریاستوں کے تاریخی ریکارڈز میں اس عمل کے حوالے موجود ہیں۔ یہ ریاستیں اکثر خود بھی اس عمل میں گہری طور پر شامل تھیں۔ تاہم عرب کے مرکزی علاقوں میں، خصوصاً ان خطوں میں جہاں بعد میں مسلم سماج پہلی مرتبہ قائم ہوا، مسیحی کلیسا کے اثر و رسوخ کو بیان کرنا اور اس کا درست اندازہ لگانا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ "نجد" جو جزیرۂ عرب کا مرکزی علاقہ ہے، کے بارے میں

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ چھٹی صدی کے اواخر میں قبیلہ "تغلب" نے مونوفیزی صورت میں مسیحیت قبول کر لی تھی۔ اسی زمانے میں ایک اور اہم قبیلے "کندہ" کے حکمران خاندان نے بھی مسیحیت اختیار کر لی تھی۔ تاہم کندہ کے معاملے میں یہ واضح نہیں ہے کہ انہوں نے مسیحیت کی کون سی شاخ اختیار کی تھی اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ اس تبدیلی کا اثر پورے قبیلے پر کس حد تک پڑا تھا۔ اس کے بعد "حجاز" کے بارے میں شواہد اور بھی کم واضح ہیں۔ حجاز جزیرۂ عرب کے مغربی حصے میں واقع تھا اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں حضرت محمد ﷺ کی ولادت ہوئی۔ دستیاب معلومات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز میں مسیحیوں کی کچھ موجودگی ضرور تھی لیکن ضروری نہیں کہ وہ مقامی مسیحی آبادی ہو اور نہ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس خطے کے حکمران اور بااثر طبقات میں کوئی نمایاں اثر ورسوخ حاصل تھا[51]۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مسیحی کلیسا عرب کے سرحدی علاقوں، خصوصاً شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں، میں موجود تھا اور ان پر خاصا اثر و رسوخ بھی رکھتا تھا۔ اسی طرح عرب کے مشرقی ساحلوں اور جنوبی عرب میں بھی مسیحیت قائم ہو چکی تھی، بالخصوص "نجران" میں اس کا اثر نمایاں تھا۔ تاہم ان تمام حقائق کو یکجا کر کے دیکھنے کے باوجود اور عرب کے سرحدی علاقوں پر اس کے قابلِ ذکر اثر ورسوخ کے باوجود مسیحیت جزیرۂ عرب کے مرکزی علاقوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی پیش رفت میں کوئی غالب اور فیصلہ کن قوت نہیں بن سکی تھی۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حواشی وحوالہ جات

[1] کتاب مقدس، پاکستان بائبل سوسائٹی، لاہور، (2011ء)، 1-سلاطین، باب 18

[2] موآبی عورت روتھ (Ruth the Moabitess) کے معاملے میں یہی ہوا۔ زمانے میں اسرائیل میں قحط پڑا تو ایک اسرائیلی شخص الیملک اپنی بیوی نعومی اور دو بیٹوں کے ساتھ موآب کے علاقے میں جا بسا۔ وہاں الیملک فوت ہو گیا۔ بعد میں نعومی کے دونوں بیٹوں نے موآبی عورتوں سے شادی کی، جن میں ایک روتھ تھی۔ کچھ عرصے بعد دونوں بیٹے بھی فوت ہو گئے، اور نعومی اپنی دو بہوؤں کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ جب نعومی نے اپنے وطن اسرائیل واپس جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے اپنی بہوؤں سے کہا کہ وہ اپنے خاندانوں کے پاس واپس چلی جائیں۔ ایک بہو تو واپس چلی گئی، لیکن روتھ نے نعومی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس نے مشہور الفاظ کہے: "جہاں آپ جائیں گی میں جاؤں گی، جہاں آپ رہیں گی میں رہوں گی۔ آپ کی قوم میری قوم ہو گی اور آپ کا خدا میرا خدا ہو گا۔" (کتابِ روتھ، باب 1، فقرہ 16) چنانچہ روتھ نعومی کے ساتھ بیت لحم آ گئی۔ بیت لحم میں روتھ کھیتوں میں بچ جانے والی بالیاں چنتی تھی تاکہ اپنا اور نعومی کا گزارہ کر سکے۔ وہ کھیت ایک مالدار اور نیک شخص "بوآز" کا تھا، جو نعومی کے خاندان کا قریبی رشتہ دار تھا۔ بوآز نے روتھ کی وفاداری اور کردار سے متاثر ہو کر اس

کے ساتھ حسنِ سلوک کیا۔ اسرائیلی رسم کے مطابق قریبی رشتہ دار بیوہ عورت کی کفالت اور خاندان کی نسل کو باقی رکھنے کی ذمہ داری لے سکتا تھا۔ آخر کار بوآز نے روتھ سے شادی کر لی۔ روتھ اور بوآز کے ہاں ایک بیٹا "عوبید" پیدا ہوا۔ عوبید، یسّی کا والد تھا، اور یسّی کو حضرت داؤد علیہ السلام کا والد بتایا جاتا ہے اس طرح روتھ حضرت داؤدؑ کی پردادی بنی۔ عیسائی روایت میں روتھ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب نامے میں بھی اس کا نام شامل کیا جاتا ہے (متی، باب 1، فقرہ 5)۔

[3] فارس کے بادشاہ سائرس کے معاملے میں ہوا۔ عہد نامہ عتیق میں اسے خدا کی طرف سے "مسیح شدہ" قرار دیا گیا ہے۔:

"خداوند اپنے ممسوح سائرس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اسکا دہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اسکے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلواڈالوں اور دروازوں کو اسکے سامنے کھول دوں اور پھاٹک بند نہ کیے جائیں گے"۔ (دیکھیے: یسعیاہ، باب 45، فقرہ 1)

[4] ملاکی، باب 1، فقرہ 11

[5] عہد نامہ عتیق کے مطابق:

"تب نینوہ کے باشندوں نے خُدا پر ایمان لا کر روزہ کی مُنادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب ٹاٹ اوڑھا۔ اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پُہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اُٹھا اور بادشاہی لباس کو اُتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ اور اُس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوہ میں یہ اعلان کیا گیا اور اس بات کی مُنادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلہ یا رمہ کُچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیئے۔ لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے مُلبس ہوں اور خُدا کے حُضور گریہ وزاری کریں بلکہ ہر شخص اپنی بُری روش اور اپنے ہاتھ کے ظُلم سے باز آئے۔ شاید خُدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ 10 جب خُدا نے اُن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بُری روش سے باز آئے تو وہ اُس عذاب سے جو اُس نے اُن پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اُسے نازل نہ کیا"۔ (یوناہ، باب 3)

[6] یعنی تقریباً وہ چار صدیاں جو حضرت عیسیٰ کے زمانے سے پہلے گزریں۔

[7] یعنی وہ جو فلسطین سے باہر رہتے تھے۔

[8] دیکھیے:

G. Vermes, Jesus the Jew, Collins, London, (1973)

[9] متی کی انجیل میں ہے:

"مَیں اِسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہُوئی بھیڑوں کے سِوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ (متی، باب 15، فقرہ 24)

[10] عہد نامہ عتیق کے مطابق:

"پھر بعض لوگ یہُودیہ سے آکر بھائیوں کو تعلیم دینے لگے کہ مُوسٰی کی رسم کے مُوافق تُمہارا ختنہ نہ ہو تو تُم نجات نہیں پا سکتے۔ 2 پَس جب پولُس اور برنباس کی اُن سے بہُت تکرار اور بحث ہُوئی تو کلِیسیا نے ٹھہرایا کہ پولُس اور برنباس اور اُن میں سے چند اَور شخص اِس مسئلہ کے لئے رَسُولوں اور بُزرگوں کے پاس یروشلیم جائیں۔۔۔ جب یروشلیم میں پُہنچے تو کلِیسیا اور رَسُول اور بُزرگ اُن سے خُوشی کے ساتھ مِلے اور اُنہوں نے سب کُچھ بیان کِیا جو خُدا نے اُن کی معرفت کِیا تھا۔ 5 مگر فریسیوں کے فِرقہ سے جو اِیمان لائے تھے اُن میں سے بعض نے اُٹھ کر کہا کہ اُن کا ختنہ کرانا اور اُن کو مُوسٰی کی شَرِیعَت پر عمل کرنے کا حُکم دینا ضرُور ہے۔ (اعمال، باب 15، فقرہ 1 تا 6)

[11] خصوصاً یوحنا (John) کی تحریروں میں۔

[12] مثلاً:

متی لکھتا ہے کہ جب رومی گورنر پنطیوس پیلاطس نے یہ کہا کہ اسے حضرت عیسیٰ میں کوئی جرم نظر نہیں آتا، تو مجمع، جس کے اکثر افراد یہودی تھے، نے پکار کر کہا: "اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر ہو!"۔(دیکھیے: متی، باب 27، فقرہ 25)

پطرس اپنے یہودی سے کہتا ہے کہ: "اسی یسوع کو تم نے مصلوب کیا"۔(اعمال، باب 2، فقرہ 23)

[13]اس عمل کے کلاسیکی مطالعہ کے لیے دیکھیے:

J. Parkes,The Conflict of the Church and the Synagogue: a Study in the Origins of Antisemitism, Socino Press, London, (1934)

[14] دیکھیے:

U. Simon, Verus Israel: A Study of the Relations between Christians and Jews in the Roman Empire, Oxford University Press, (1986), P. 217-223

J. N. D. Kelly, Golden Mouth: the Story of John Chrysostom, Duckworth, London, (1995), P. 63-66.

[15] دیکھیے:

R. L. Wilken, Chrysostom and the Jews, University of California Press, (1983)

[16] متی نے لکھا ہے کہ:

"جب یسُوع ہیرودِیس بادشاہ کے زمانہ میں یہُودیہ کے بیت لحم میں پَیدا ہُوا تو دیکھو کئی مجُوسی پُورب سے یروشلیم میں یہ کہتے ہُوئے آئے کہ یہُودیوں کا بادشاہ جو پَیدا ہُوا ہے وہ کہاں ہے؟ کیونکہ پُورب میں اُس کا ستارہ دیکھ کر ہم اُسے سجدہ کرنے آئے ہیں۔ یہ سُن کر ہیرودِیس بادشاہ اور اُس کے ساتھ یروشلیم کے سب لوگ گھبرا گئے۔ اور اُس نے قَوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے اُن سے پُوچھا کہ مسیح کی پَیدایش کہاں ہونی چاہئے؟ اُنہوں نے اُس سے کہا یہُودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی کی معرفت یوں لکھا گیا ہے کہ اَے بیت لحم یہُوداہ کے علاقے تُو یہُوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں۔ کیونکہ تُجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری اُمّت اِسرائیل کی گلّہ بانی کرے گا۔ اِس پر ہیرودِیس نے مجُوسیوں کو چُپکے سے بُلا کر اُن سے تحقیق کی کہ وہ ستارہ کِس وقت دِکھائی دِیا تھا۔ اور یہ کہہ کر اُنہیں بیت لحم کو بھیجا کہ جا کر اُس بچّے کی بابت ٹھِیک ٹھِیک دریافت کرو اور جب وہ ملے تو مُجھے خبر دو تاکہ مَیں بھی آکر اُسے سجدہ کرُوں۔ وہ بادشاہ کی بات سُن کر روانہ ہُوئے اور دیکھو جو ستارہ اُنہوں نے پُورب میں دیکھا تھا وہ اُن کے آگے آگے چلا۔ یہاں تک کہ اُس جگہ کے اُوپر جا کر ٹھہر گیا جہاں وہ بچّہ تھا۔ وہ ستارے کو دیکھ کر نہایت خُوش ہُوئے۔ اور اُس گھر میں پہُنچ کر بچّے کو اُس کی ماں مریم کے پاس دیکھا اور اُس کے آگے گِر کر سجدہ کیا اور اپنے ڈِبّے کھول کر سونا اور لُبان اور مُر اُس کو نذر کیا۔ اور ہیرودِیس کے پاس پھِر نہ جانے کی ہدایت خواب میں پا کر دُوسری راہ سے اپنے مُلک کو روانہ ہُوئے"۔(متی، باب 2، فقرہ 1 تا 12)

[17] اس میں لکھا ہے کہ:

" قیصریہ میں کُرنیلیس نام ایک شخص تھا۔ وہ اُس پلٹن کا صُوبہ دار تھا جو اطالیانی کہلاتی ہے۔ 2 وہ دِیندار تھا اور اپنے سارے گھرانے سمیت خُدا سے ڈرتا تھا اور یہُودیوں کو بہُت خَیرات دیتا اور ہر وقت خُدا سے دُعا کرتا تھا۔ 3 اُس نے تیسرے پہر کے قریب رویا میں صاف صاف دیکھا کہ خُدا کا فرِشتہ میرے پاس آکر کہتا ہے کُرنیلیس۔ 4 اُس نے اُس کو غَور سے دیکھا اور ڈر کر کہا خُداوند کیا ہے؟ اُس نے اُس سے کہا تیری دُعائیں اور تیری خَیرات یادگاری کے لئے خُدا کے حضُور پہُنچیں"۔(اعمال، باب 10، فقرہ 1 تا 4)

[18] عہد نامہ عتیق کے مطابق:

"پولُس نے اریوپگُس کے بیچ میں کھڑے ہو کر کہا کہ اَے اتھینے والو! مَیں دیکھتا ہُوں کہ تُم ہر بات میں دیوتاؤں کے بڑے ماننے والے ہو۔

23 چُنانچہ میں سیر کرتے اور تُمہارے معبُودوں پر غَور کرتے وقت ایک اَیسی قُربان گاہ بھی پائی جِس پر لکھا تھا کہ نامعلُوم خُدا کے لئے۔ پَس جِس کو تُم بغَیر معلُوم کئے پُوجتے ہو مَیں تُم کو اُسی کی خَبر دیتا ہُوں۔ 24 جِس خُدا نے دُنیا اور اُس کی سب چِیزوں کو پَیدا کیا وہ آسمان اور زمِین کا مالِک ہو کر ہاتھ کے بنائے ہُوئے مندروں میں نہیں رہتا"۔ (اعمال، باب 17، فقرہ 22، 23، 24)

[19] اصل عبارت یوں ہے:

"کیونکہ دیمیترِیُس نام ایک سُنار تھا جو اَرتمِس کے رُوپہلے مندر بنوا کر اُس پیشہ والوں کو بہُت کام دِلوا دیتا تھا۔ اُس نے اُن کو اور اُن کے متعلق اَور پیشہ والوں کو جمع کر کے کہا اَے لوگو! تُم جانتے ہو کہ ہماری آسودگی اِسی کام کی بدَولت ہے اور تُم دیکھتے اور سُنتے ہو کہ صِرف اِفِسُس ہی میں نہیں بلکہ تقریباً تمام آسیہ میں اِس پولُس نے بہُت سے لوگوں کو یہ کہہ کر قائِل اور گُمراہ کر دِیا ہے کہ جو ہاتھ کے بنائے ہُوئے ہیں وہ خُدا نہیں ہیں۔ پَس صِرف یہی خطرہ نہیں کہ ہمارا پیشہ بے قدر ہو جائے گا بلکہ بڑی دیوی اَرتمِس کا مندر بھی ناچِیز ہو جائے گا اور جِسے تمام آسیہ اور ساری دُنیا پُوجتی ہے خُود اُس کی عظمت جاتی رہے گی۔ وہ یہ سُن کر قہر سے بھر گئے اور چِلّا چِلّا کر کہنے لگے کہ اِفِسیوں کی اَرتمِس بڑی ہے۔ اور تمام شہر میں ہلچل پڑ گئی اور لوگوں نے گیُس اور اَرِسترخُس مَکِدُنیہ والوں کو جو پولُس کے ہم سفر تھے پکڑ لیا اور ایک دِل ہو کر تماشاگاہ کو دَوڑے۔ جب پولُس نے مجمع میں جانا چاہا تو شاگِردوں نے جانے نہ دِیا۔۔۔جب اُنہیں معلُوم ہُوا کہ یہ یہُودی ہے تو سب ہم آواز ہو کر کوئی دو گھنٹے تک چِلّاتے رہے کہ اِفِسیوں کی اَرتمِس بڑی ہے۔ پِھر شہر کے محرّر نے لوگوں کو ٹھنڈا کر کے کہا اَے اِفِسیوں کاشہر بڑی دیوی ارتمِس کے مندر اور اُس مُورت کا مُحافِظ ہے جو زیُوس کی طرف سے گری تھی؟۔ پَس جب کوئی اِن باتوں کے خِلاف نہیں کہہ سکتا تو واجِب ہے کہ تُم اِطمینان سے رہو اور بے سوچے کُچھ نہ کرو۔ کیونکہ یہ لوگ جن کو تُم یہاں لائے ہو نہ مندر کو لُوٹنے والے ہیں نہ ہماری دیوی کی بدگوئی کرنے والے۔ پَس اگر دیمیترِیُس اور اُس کے ہم پیشہ کِسی پر دعویٰ رکھتے ہوں تو عدالت کُھلی ہے اور صُوبہ دار مَوجُود ہیں۔ ایک دُوسرے پر نالِش کریں۔ اور اگر تُم کِسی اَور امر کی تحقیقات چاہتے ہو تو باضابطہ مجلِس میں فَیصلہ ہو گا۔ کیونکہ آج کے بلوے کے سبب سے ہمیں اپنے اُوپر نالِش ہونے کا اندیشہ ہے اِس لئے کہ اِس کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اِس صُورت میں ہم اِس ہنگامہ کی جوابدِہی نہ کر سکیں گے۔ یہ کہہ کر اُس نے مجلِس کو برخاست کیا۔ (اعمال، باب 19)

[20] جو رومی سلطنت کے مغربی، لاطینی زبان بولنے والے حصے میں زیادہ اثر ورسوخ رکھتا تھا۔

[21] جہاں زیادہ تر مسیحی یونانی زبان بولتے تھے۔

[22] تفصیل کے لیے دیکھیے:

Justin, First Apology: 10
Clement, Miscellanies: 6: 5
K. Cracknell, Considering Dialogue, British Council of Churches, London, (1981), P. 30

جسٹن اور کلیمنٹ کی مکمل بحث کے لیے دیکھیے:

H. Chadwick, Early Christian Thought and the Classical Tradition, Oxford University Press, (1966)

آبائے کلیسیا اور بائبلی مواد کی تفصیلی بحث، جس میں جسٹن بھی شامل ہے، کے لیے دیکھیے:

R. Plantinga (ed.), Christianity and Plurality, Blackwell, Oxford, (1999), P. 9-89

[23] مثلاً وہ حصہ جس میں "عادل انسان" کے مصلوب کیے جانے کا ذکر آتا ہے۔

[24] دیکھیے:

Republic, Penguin Classics edition, (1974), P. 107, 108

[25] یوحنا کا پہلا خط، باب 2، فقرہ 22

[26] یوحنا کا پہلا خط، باب 4، فقرہ 2،3

[27] ایبیونیت (Ebionism) ابتدائی مسیحیت کا ایک یہودی- مسیحی فرقہ تھا جو پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں موجود تھا۔ ایبیونائٹس حضرت عیسیٰؑ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں بلکہ ایک عظیم انسان، نبی اور مسیح مانتے تھے۔ وہ شریعتِ موسوی کی پابندی کو ضروری سمجھتے تھے اور یہودی رسوم واحکام پر عمل کرتے تھے۔ اس فرقے نے پولس رسول کی بعض تعلیمات کو قبول نہیں کیا اور اس بات پر زور دیا کہ عیسیٰؑ کی اصل دعوت یہودی مذہبی روایت کے اندر سمجھی جانی چاہیے۔ بعد میں کلیسائی عقائد کے غالب ہونے کے ساتھ یہ فرقہ بتدریج ختم ہو گیا۔

[28] یہ ابتدائی صدیوں کی ایک مذہبی و فلسفیانہ تحریک تھی جو نجات کے لیے خاص باطنی علم (Gnosis) کو بنیادی اہمیت دیتی تھی۔ گناسٹک گروہوں کے مطابق مادی دنیا ناقص یا شر سے آلودہ ہے، جبکہ انسان کی اصل حقیقت ایک روحانی جوہر ہے جو اس دنیا میں قید ہے۔ ان کے نزدیک نجات ایمان یا اعمال سے زیادہ اس مخفی روحانی معرفت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جو انسان کو اپنی حقیقی اصل اور خدا سے تعلق کا شعور دیتی ہے۔ گناسٹیسزم کے مختلف مکاتبِ فکر تھے، لیکن کلیسائے مسیحی نے اسے اپنے بنیادی عقائد کے خلاف قرار دے کر بدعت شمار کیا۔ دوسری اور تیسری صدی میں اس کے اثرات نمایاں رہے، مگر بعد میں اس کی اہمیت کم ہوتی گئی۔

[29] سیرنتھس (Cerinthus) پہلی صدی عیسوی کے آخر میں ظاہر ہونے والا ایک ابتدائی مسیحی مفکر تھا جسے بعد میں کلیسیا نے بدعتی قرار دیا۔ اس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ ایک عام انسان تھے جو حضرت مریمؑ اور حضرت یوسفؑ سے پیدا ہوئے، جبکہ "مسیح" ایک آسمانی روحانی ہستی تھی جو بپتسمہ کے وقت حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ وہ یہ بھی عقیدہ رکھتا تھا کہ مصلوب ہونے سے پہلے یہ آسمانی مسیح حضرت عیسیٰؑ سے جدا ہو گیا تھا، اس لیے دکھ اور موت صرف انسانی عیسیٰؑ نے برداشت کی۔ سیرنتھس شریعتِ موسوی کی پابندی کو اہم سمجھتا تھا اور بعض روایات کے مطابق کائنات کی تخلیق کو ایک کمتر روحانی ہستی سے منسوب کرتا تھا۔ وہ زمین پر مسیح کی ایک ہزار سالہ بادشاہی کا بھی قائل تھا۔ اس کے یہ نظریات بعد کے راسخ العقیدہ مسیحی عقائد سے مختلف تھے، اسی لیے کلیسیا نے انہیں بدعت قرار دیا۔

[30] متی، باب 3، فقرہ 7

[31] یوحنا، باب 14، فقرہ 6

[32] اعمال، باب 4، فقرہ 12

[33] یوحناوی اقوال کے لیے دیکھیے:

W. Meeks, The man from heaven in Johannine Sectarianism, Journal of Biblical Literature, 91, (1972), P. 44-72

مذکورہ قول کی توضیح کے لیے دیکھیے:

K. Cracknell, A Christology for Religious Pluralism, Epworth, London, (1986), P. 69-109

[34] دیکھیے: یوحنا کا مکاشفہ

[35] قسطنطین کے عہد کی تفصیلات کے لیے دیکھیے:

A. H. M. Jones,Constantine and the Conversion of Europe, Penguin, Harmondsworth, (1972)

[36] المائدہ: 14

[37] دیکھیے:

S. Runciman, The Eastern Schism, Oxford University Press, (1955), Chapter:1

38 اس کو مسلمان علماء نے عقیدۃالامانۃ سے موسوم کیا ہے۔

39 جسے قسطنطین نے 324 عیسوی میں قائم کیا تھا۔

40 جو چوتھی صدی میں شمالی افریقہ میں شروع ہوئی۔

41 اعمال، باب 11، فقرہ 26

42 جو افسس (Ephesus) اور خلقیدون (Chalcedon) کی کونسلوں کے فیصلوں کو قبول کرتا تھا۔

43 جو ان فیصلوں کو قبول نہیں کرتی تھیں۔

44 خصوصاً مصر اور شام

45 مونوفیزی کلیسیا کی تفصیلات کے لیے دیکھیے:

W. H. C. Frend, The Rise of the Monophysites, Cambridge University Press, (1972)

نیسٹوری کلیسیا، جس کو بعض اوقات مشرقی کلیسیا بھی کہاجاتا ہے، کے لیے دیکھیے:

Bulletin of the John Rylands Library, 78:3, (1996)

تمام غیر خلقیدونی کلیسیاؤں کی تفصیل کے لیے دیکھیے:

A. S. Atiya, A History of Eastern Christianity, Methuen, London, (1968)

46 جو عام طور پر "فلپ العربی" (Philip the Arab) کے نام سے معروف ہے اور 244 سے 249ء تک حکمران رہا۔

47 دیکھیے:

S. Trimingham, Christianity Among the Arabs in Pre-Islamic Times, Longman, London, (1979), P. 58-59

48 یعنی اس خطے میں جو عراق سے متصل تھا اور جو اُس زمانے میں ساسانی سلطنت (Sassanian Empire) کاایک صوبہ تھا۔

49 ایک ایسا نام جو اُس زمانے میں آج کے جزیرۂ بحرین کے بجائے عرب کے مشرقی ساحلی علاقوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

50 دیکھیے:

Christianity Among the Arabs in Pre-Islamic Times, P. 280

51 Ibid, P. 260